ظفر احمد صدیقی

شبلی بحیثیت شاعر

عجیب بات ہے کہ شبلی شاعر ہوتے ہوئے بھی شاعر تسلیم نہیں کیے جاتے۔ ادبی تاریخیں اور تذکرے عموماً شبلی کے ذکر سے خالی ہیں۔ ناقدوں کی نگاہ میں بھی ان کی شاعرانہ حیثیت مشتبہ ہے۔ بات شاعروں کی چل پڑے تو اوّلا ان کا ذکر آتا ہی نہیں اور آتا بھی ہے تو کچھ مروّت اور کچھ لحاظ میں ان کی شاعری پر ہوں ہاں کر دی جاتی ہے اور بس۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعرانہ سرگرمیوں کا اب تک تحقیقی جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کی گئی۔ شبلی کے ساتھ اس بے اعتنائی کا بڑا سبب نفسیاتی ہے۔ انسانی کمالات کے اعتراف میں شخصیتوں کے طریق تعارف اور اندازِ پیش کش کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ شبلی کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اُنھوں نے ملک میں ہمہ گیر شہرت ومقبولیت حاصل کی، لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک عالمِ دین اور مورخ ہیں، الفاروق اور سیرتِ نعمان کے مصنف ہیں۔ تحریکِ ندوہ کے ایک سرگرم رکن ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ان کی شاعرانہ حیثیت دب گئی ہے یا غیر اہم قرار دے دی گئی ہے۔

اس سلسلے میں کچھ قصور خود شبلی کا بھی ہے۔ اُنھوں نے مصلحتِ وقت اور ہم عصر علماء کے تاثر وتعصب سے مرعوب ہو کر اپنی شاعرانہ حیثیت پر نہ تو زور دیا، نہ اسے منوانے کی خاطر خواہ کوشش کی۔ بلکہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہے، کیونکہ ان کے دل میں بھی یہ چور تھا کہ عالمِ دین پر شاعری کی قبا راست نہیں آتی۔

شبلی اور ان کے ہم عصر اس بات میں معذور قرار دیے جا سکتے ہیں، لیکن قدرت کی

ستم ظریفی دیکھیے کہ ان کی سوانح عمری لکھنے کی خدمت بھی ایک عالمِ دین سیّد سلیمان ندوی کے حصے میں آئی۔

سیّد صاحب بذاتِ خود نہایت ثقہ اور معتبر عالم تھے۔ اس لیے اُنہیں علماء کے گروہ میں استاد کی حیثیت مستحکم کرانے کا خیال زیادہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے بھی ان کی شاعرانہ حیثیت کو غیر اہم اور ثانوی قرار دینے کی پوری کوشش کی۔ حتیٰ کہ ''کلیاتِ شبلی'' کے دیباچے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے:

''مولانائے مرحوم کے علمی کمالات میں اگرچہ فارسی اور اُردو کی شاعری بھی داخل ہے، تاہم اُنھوں نے بذاتِ خود کبھی اس کو اپنا قابلِ فخر کارنامہ نہیں قرار دیا اور اس حیثیت سے کبھی اپنے ہم عصروں کی صف میں حریفانہ حیثیت سے کھڑے نہیں ہوئے، بلکہ یہ ان کا صرف ایک تفریحی مشغلہ تھا اور زیادہ تر اس کی تحریک خاص خاص موثرات ومحرکات کی وجہ سے ہوتی تھی۔''(۱)

جب عزیز اور لائق شاگرد نیز جانشین نے یہ روش اختیار کی تو دوسروں نے بھی تحقیق و تفتیش کی زحمت گوارا کیے بغیر آواز میں آواز ملانا ہی مناسب سمجھا۔ اس طرح شبلی کی شاعرانہ بے اعتباری ایک ادبی مسلمہ بن گئی۔

مزید برآں شبلی کی ایک بدقسمتی یہ بھی رہی کہ ان کی شاعری کا ایک معتد بہ حصہ منظرِ عام پر نہیں آ سکا۔ مثلاً ان کا ابتدائی فارسی کلام جس بیاض میں جمع تھا، وہ غازی پور کے ایک جلد ساز کے یہاں سے غائب ہوگئی۔(۲) ابتدائی دَور کی بیشتر اُردو غزلیں جن میں تسنیم تخلص باندھا گیا تھا، اب دستیاب نہیں۔ اعظم گڑھ کے مشاعروں کی بھی اکثر غزلیں محفوظ نہیں۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں بیاض کا نصف حصہ دوبارہ چوری ہوگیا۔(۳) دیوانِ فارسی طبع ہوا تو مدحیہ نظمیں، امرا کے خیر مقدم اور بیشتر مراثی شریکِ اشاعت نہیں کیے گئے۔(۴) غزلیات میں بھی منتخب اشعار کے علاوہ بقیہ قلم انداز کر دیئے گئے۔ حیدرآباد کے مشاعروں اور صحبتوں کی یادگار بھی بجز ایک غزل کے اور کچھ باقی نہیں۔(۵)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر خود شبلی نے اپنے بعض اشعار کا انتساب اپنی طرف مناسب نہ سمجھا۔ اس سلسلے میں ظفر الملک علوی مدیر الناظر کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ راقم الحروف کو ایک قلمی بیاض سے مولانا شبلی کے کچھ اشعار کی نقل مل گئی۔ لیکن جب مولانا سے ذکر آیا اور الناظر میں ان کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تو اُنھوں نے بہ اصرار اس سے باز رکھا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر ان کی اشاعت کی جائے گی تو راقم الحروف سے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔(۶)

خلاصہ یہ کہ مختلف اسباب کی بنا پر شبلی کی شاعرانہ حیثیت صحیح معنوں میں واضح اور متعین نہ ہوسکی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی شعر گوئی اور شاعرانہ سرگرمیوں کا منصفانہ جائزہ لیتے ہوئے، ان کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ ان میں شاعری کا فطری جوہر موجود تھا یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ شعر وسخن کا مذاق اُنھوں نے ورثے میں پایا تھا اور اس کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ ان کے نانا شیخ قربان علی قنبر انصاری وکالت جیسے خشک پیشے کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے اور والدِ بزرگوار شیخ حبیب اللہ وکالت، زمینداری اور دوسری مصروفیات کے ساتھ فارسی شعر و ادب کا پاکیزہ اور مثالی ذوق رکھتے تھے۔ خود شبلی کے بارے میں ان کے بچپن کے دوست مولوی محمد عمر صاحب کا بیان ہے:

''مولانا میں ادبی مذاق بچپن ہی سے تھا۔ اس زمانے میں جب وہ محض مبتدی تھے، کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آ جاتا۔''(۷)

سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''وہ مجھ سے خود فرماتے تھے کہ بچپن میں وہ فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے تھے۔ کتابیں الٹتے پلٹتے اور شعرا کے دیوان پڑھتے اور مناسب طبع

سے ان کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے۔''(۸)

ان کے بالکل ابتدائی دَور کے استاد مولوی عبداللہ صاحب فرماتے تھے:

''مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثارِ کمال پائے جاتے تھے۔ ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے کا وقت تھا، یک بیک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں۔''(۹)

طالب علمی کے زمانے میں اُنھیں ایک چادر کی ضرورت محسوس ہوئی تو والد کو یہ شعر لکھ بھیجا:(۱۰)

پدر جس کا یوں صاحبِ تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو؟

لیکن عہدِ طفلی یا عنفوانِ شباب کی دلچسپیوں کو استحکام ہوتا ہے نہ ثبات۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلامت روی کج روی سے اور شاعرانہ طبیعت خشک مزاجی سے بدل جاتی ہے۔ یا بچپن کا ذوق وشوق سرزنش اور فہمائش کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے، لیکن شبلی اس نازک مرحلے سے صحیح سلامت گزر گئے۔ خوش قسمتی سے ان کے گھر کا ماحول ایک حد تک ادبی تھا اور اساتذہ بھی عموماً شعر وسخن کے ادا شناس تھے۔ اس لیے ان کا ادبی مذاق نامساعد حالات کا شکار ہونے کے بجائے نکھرتا اور سنورتا گیا۔ اس سلسلے میں شبلی کا اپنا بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

''میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:

سر بہ بستان چوں دہد جلوۂ یغمائی را
اوّل از سرو کند جامۂ رعنائی را

''والدِ مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر 'کند' کے بجائے 'کشد' کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے، فصیح نہیں۔ سب چپ ہو گئے۔ والدِ مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا نہیں یہی لفظ شعر کی جان ہے۔ شعر کا

مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دِکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اُتار لیتا ہے۔ لباس اُتارنے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اُتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لیے جائیں یا نچوا لیے جائیں۔ فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں: جامہ کشیدن اور جامہ کندن۔ چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے۔ اس لیے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے۔ تمام حاضرین نے اس توجیہہ کی بے ساختہ تحسین کی۔" (۱۱)

شعری مزاج کی ساخت و پرداخت میں یہ اندازِ تربیت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اب اساتذہ کو لیجیے، شبلی کے ادبی مزاج کی تشکیل میں حصہ لینے والے اساتذہ میں مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی، مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اوّل الذکر کا شمار اُردو کے معروف شاعروں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک زمانے میں مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور کے مہتمم تھے اور شبلی اس مدرسے کے طالب علم۔ اس عمومی رشتے کے علاوہ استاد کو عزیز شاگرد سے تعلقِ خاطر بھی تھا۔ شعروشاعری میں استفادے کی شہادتیں بھی بعض خطوط میں ملتی ہیں۔ (۱۲)

مولانا فاروق چڑیا کوٹی فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے۔ شبلی میں فارسی گوئی کا ذوق اُنھیں کا پیدا کردہ ہے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری اپنے دَور میں عربی زبان وادب کے سب سے بڑے رمز شناس اور بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ کبھی کبھی اُردو میں بھی شعر کہتے۔ شبلی کے اندر عربی نثر و نظم کا صحیح ذوق انہیں کے فیضانِ صحبت کی بدولت پیدا ہوا۔ ان اساتذہ اور گردوپیش کے شاعرانہ ماحول کی بدولت شبلی کو ابتدائے جوانی ہی میں شاعری اور شعرگوئی سے غیر معمولی مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وطن میں آئے دن ہونے والے مشاعروں میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک

ہوتے اور خود بھی ادبی نشستوں کا اہتمام کرتے تھے۔(۱۳)

تعلیم سے فراغت کے بعد شبلی بسلسلۂ ملازمت علی گڑھ، حیدرآباد اور لکھنؤ میں قیام پذیر رہے۔ اسے حسنِ اتفاق ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ اس دوران پیشے کے اعتبار سے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف جیسی مشغولیتوں سے وابستہ رہے۔ ساتھ ہی حلقہ احباب بھی علم دوست، ادب نواز اور شعرا حضرات ہی پر مشتمل رہا۔ اس لیے انہیں کبھی ماحول کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے یا طبیعت پر جبر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

علی گڑھ میں شہر بھر کے مانے ہوئے ''استاد شاعر'' قیس تو پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ ان کی اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ اکبر الہ آبادی بھی اس زمانے میں بہ حیثیت منصف علی گڑھ میں ہی مقیم تھے۔ ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔(۱۴) مولانا حالی جب آتے تو ان سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

حیدرآباد پہنچ کر داغ دہلوی سے بہت اچھے روابط پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ شہر کی ادبی محفلوں میں برابر شریک ہوتے تھے۔(۱۵)

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی معتمدی کے دوران عموماً سال میں ایک بار بمبئی جاتے تھے۔ یہاں کے خوش گوار ماحول اور دلچسپ صحبتوں نے بھی ان کے ذوقِ شعر گوئی کی آبیاری میں حصہ لیا ہے۔(۱۶)

اس گفتگو کا منشا یہ نہیں کہ ادبی ماحول کسی کو شاعر بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے شبلی بھی اپنے مخصوص ماحول اور حالات کی بدولت شاعر بن گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال غیر منطقی اور غیر مشاہداتی ہے۔ کہنا صرف اس قدر ہے کہ ان کی شاعرانہ طبیعت اور ذوقِ سخن وری کو سازگار حالات اور ماحول نے کچھ اور سنوار دیا تھا۔ ایسے میں ان کی شاعری محلِ تعجب نہیں بلکہ اس کا فطری و منطقی جواز موجود ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شبلی شاعر اور فطری شاعر تھے تو پھر اپنے خطوط میں دوسروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں کہ شاعری ان کے لیے تفریحِ طبع کا

ذریعہ ہے، ورنہ وہ حقیقی معنوں میں شاعر نہیں بلکہ انہیں نظم گوئی پر اتنی بھی قدرت نہیں کہ ولادت، وفات یا ایسی ہی کسی موقع پر فرمائش اور خواہش کے باوجود کوئی قطعۂ تاریخ لکھ سکیں۔ ایسے تمام خطوط کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

''یہاں عثمان کے صاحب زادے کے لیے کیا نظم لکھوں! اب وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی۔ میاں اسحٰق و مہدی کو خدا اولاد دے تب بھی کچھ نہ لکھ سکوں گا۔ شعر کہنا اب ایسا پہاڑ ہو گیا ہے کہ سابق کے اشعار دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، کہ کیا میں نے ہی لکھے ہیں۔'' (۱۷)
(بنام ماسٹر محمد شفیع، ۱۵/ مارچ ۱۸۹۵ء)

''شاہ صاحب کی قبل از وقت جدائی نے واقعی سخت صدمہ پہنچایا۔ شعر و شاعری پر اب میرا قابو نہیں، بلکہ میں اس کے قابو میں ہوں، ورنہ قطعۂ تاریخ لکھنا محبت اور اخلاص کا فرض تھا۔'' (۱۸) (بنام مہدی افادی، ۸/ مئی ۱۹۰۷ء)

''میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں، یعنی بغیر کسی فوری تاثر ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ بار بار احباب نے فرمائش کیں اور کئی کئی دن طبیعت پر زور ڈالا۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ اس لیے طالبِ معافی ہوں۔'' (۱۹) (بنام سیّد عبدالحکیم دسنوی، ۲۲/ ستمبر ۱۹۱۳ء)

''اخبارات میں نظمیں دیکھ کر آپ مجھ کو زندہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن کبھی اتفاق سے دیکھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو رحم آئے گا کہ ایک مردہ متحرک فرمائش کے لیے موزوں نہیں۔'' (۲۰)
(بنام حکیم غلام غوث بہاول پوری، ۹/ نومبر ۱۹۱۳ء)

یہاں راقم السطور پر بظاہر ''مدعی ست، گواہ چست'' کی مثال صادق آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر خطوط فرمائشی تاریخ گوئی سے معذرت کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ روز روز کی فرمائشوں سے تنگ آ کر انھوں نے احباب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری چونکہ الہامی و عطائی ہے، اس لیے اس قسم کی تعمیلِ ارشاد ان کے بس کی بات نہیں۔

ایڈیٹر، الناظر کے خط میں اصل زور شاگردی کی نفی پر ہے۔ شاعری کی نفی کو جذبۂ

خاکساری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس سے انکار مشکل ہے کہ وہ شاعری کو اپنی عالمانہ شان کے منافی سمجھتے تھے اور اپنی شاعرانہ حیثیت کا بے محابا اظہار انہیں پسند نہیں تھا۔ اس کی جانب اجمالی اشارہ گزر چکا۔ یہاں اس کے اسباب تفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں:

شبلی نے قدیم طرز کے مدارس میں، قدیم طرز کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، فارغ التحصیل ہو کر عالمِ دین کہلائے۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو نیاز فتح پوری کی طرح اس کوچے کو خیرباد کہہ دیتے یا اپنی روایت کا جزو بن کر کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ اُنھوں نے دوسری راہ اختیار کی۔ چنانچہ ان کی بیشتر تصانیف اپنے آخری تجزیے میں رہتی ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی کے لیے ان کا مرتبہ نصابِ تعلیم، علومِ قدیمہ ہی کی تشکیلِ جدید ہے۔ اسی طرح ان کی وضع قطع، نشست و برخواست اور کردار و گفتار پر بھی عالمانہ چھاپ گہری تھی۔ دوسری طرف چونکہ شعر و شاعری کا بیشتر حصہ اسلامی اقدار پر پورا نہیں اترتا۔ اس لیے علما اسے بہت زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی: اسلام اکثر فنونِ لطیفہ کی طرح عموماً شاعری کا بھی ہرگز قدردان نہیں اور نہ شاعروں کی ہمت افزائی کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کے دربار میں کوئی کرسی ہرگز شاعروں کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ عام شاعری میں بجز خیال آرائی اور مبالغہ پروری کے اور کچھ نہیں ہوتا۔'' (۲۱) شبلی اس صورتِ حال کی بنا پر ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل''۔ والی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر اُنھوں نے حریفوں کو مطمئن کرنے کے لیے اعلان کر دیا کہ شاعری میرے لیے نہ ذریعۂ کمال ہے، نہ ذریعۂ عزت بلکہ محض وقتی مشغلہ اور تفریحِ طبع کا سامان ہے، لیکن اس کی طرف طبعی میلان کے سبب اس سے کنارہ کش نہیں ہوئے، لیکن اس کی طرف طبعی میلان کے سبب اس سے کنارہ کش نہیں ہوئے، بلکہ تفریحِ طبع کی آڑ میں مسلسل دادِ سخن دیتے رہے۔ دوسرے قرائن و شواہد کے علاوہ، اس کا اندازہ ایک خط سے بھی ہوتا ہے: لکھتے ہیں:

فغاں کہ از خرد و عشق کردہ ایم قبول
دو کارخانہ کہ با یک دگر نمی گردد

ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری، ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں، لیکن بہرحال چارہ بھی نہیں۔ ندوۃ فرضِ مذہبی ہے اور شاعری فرضِ طبعی، کس کو چھوڑوں۔'' (۲۲) بنام زہرا بیگم، ۲۷/ فروری ۱۹۰۹ء)

شبلی کی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں بہت سے اختلافی مسائل ان کے خطوط کی مدد سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہی مسئلہ کہ وہ شاعری کو تفریحِ طبع کا سامان سمجھتے تھے یا قابلِ فخر کارنامہ گردانتے تھے! مکاتیبِ شبلی کے درج ذیل اقتباسات سے طے ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اِن دِنوں میں نے ایک واسوخت لکھا ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر اس کو لکھ سکا ہوں۔ واقعی نہایت درد ہے۔'' (۲۳) (بنام مولوی محمد سمیع، ۲۷/ مارچ ۱۸۸۴ء)

''واسواخت فارسی کے پندرہ بند ہیں، یعنی ۴۵ --- حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا۔'' (۲۴) (بنام مولوی محمد سمیع، ۲۴/ اپریل ۱۸۸۴ء)

''سنیے! ایک بہاریہ قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک صرف ۲۷ شعر ہوئے، مگر اُمید ہے کہ اُمید سے بڑھ کر ہوئے۔ غالباً غالب سے کم رتبے کا نہ ہو۔ توارد کے ڈر سے قصائد غالب تم سے طلب کیا۔'' (۲۵) (بنام مولوی محمد سمیع صاحب، ۱۶/ جون ۱۸۸۶ء)

''ان دنوں --- سیّد محمد حسن صاحب وزیرِ ریاست پٹیالہ تشریف لائے ہیں۔ جلسۂ دعوت میں سیّد محمود کی فرمائش سے میں نے چند بند فارسی میں لکھے اور کھانے کے بعد پڑھے۔ عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ تمام حضارِ مجلس میں حقیقت میں بے تاب ہو گئے۔ سیّد محمود صاحب اُٹھ اُٹھ کر ہر بند کو کئی بار پڑھواتے۔ وزیر صاحب نے پڑھ کر کہا، ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے۔ ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا۔'' (۲۶) (بنام مولوی محمد سمیع، مارچ ۱۸۸۶ء)

''انصاری وفد جو قسطنطنیہ سے واپس آیا۔ اس پر میں نے ایک نظم لکھی تھی، شاید تم نے دیکھی ہو، زمیندار اور وکیل میں چھپی تھی۔ جلسے میں تمام لوگ بے اختیار روتے تھے، مجھ پر خود بھی

رقت طاری تھی۔'' (۲۷) (بنام مولوی حمید الدین فراہی، ۲۰/اگست ۱۹۱۳ء)

''کل ایک غزل قلم سے نکلی۔ میرا کبر حسین صاحب کو بھیجی، وہ بہت ریجھے۔ ان کا خط بھیجتا ہوں، لیکن اس پر یقین نہ کر لیجیے گا۔ ورنہ غزل پھیکی نظر آئے گی۔'' (۲۸) (بنام مہدی افادی، ۱۰/اپریل ۱۹۰۷ء)

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان سطور کا لکھنے والا، اپنی شعری تخلیقات کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا شاعرانہ احساسِ کمال کے جذبے سے محروم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی اپنی شاعری کے قدردان تھے اور سخن فہم دوستوں سے دادِ ہنر بھی چاہتے تھے۔ البتہ اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح یہ سوال کہ ان کی شاعرانہ سرگرمیوں کا درجہ دوسری مشغولیتوں کے مقابل بنیادی ہے یا ثانوی، اس کا شافی جواب بھی ان کے خطوط ہی کی مدد سے دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے شاعرانہ مزاج و کردار کی بھرپور آئینہ داری انہیں کے ذریعے ہوتی ہے اور یہیں ان کی شاعرانہ نفسیات کے سبھی پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اپنی شعری کاوشوں سے محبت و شیفتگی، احباب سے مزے لے لے کر ان کا تذکرہ کبھی مطالعہ کی فرمائش، کبھی سنانے کا وعدہ۔ کبھی شعری گلدستوں کا تحفہ پر تحفہ اور کبھی تہی دامنی کا شکوہ۔ یہ وہ شاعرانہ ادائیں ہیں جو ان خطوط کے علاوہ اور کہیں محفوظ نہیں۔

اس لیے مندرجہ ذیل اقتباسات اپنی کثرت کے باوصف توجہ کے مستحق ہیں۔ لکھتے ہیں:

''غزل پھر کبھی بھیجوں گا۔'' (۲۹) (بنام مولوی محمد سمیع، ۱۸۸۳ء)

''آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں۔ مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کر لیتا ہوں۔ رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی۔ دو تین شعر مزے کے ہیں، تمہیں بھیجتا ہوں۔'' (۳۰) (بنام مولوی محمد سمیع، ۱۸/جنوری ۱۸۸۴ء)

''دو غزلیں حال میں لکھی گئی ہیں، تم کو بھیجتا ہوں۔ فارسی غزل جو حمید کو بھیجی گئی ہے،

عہدہ پرواز پر لکھی گئی ہے۔ اگر چہ فہم کی توقع نہیں، اسے دیکھنا تم۔'' (۳۱) (بنام مولوی محمد سمیع، ۲۶ر جنوری ۱۸۸۴ء)

''عزیزی اسحٰق کو ایک خط نظم میں لکھا ہے--- دو شعر اس میں اور بڑھالو--- ایک اُردو غزل ذیل میں پاؤ گے۔ ایک دن یوں ہی لکھ دی تھی--- تم دو قصیدے مانگتے ہو--- کون؟

ایک عہد کا قصیدہ تو البتہ میں نے لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے۔ کبھی تم کو بھیج دوں گا۔'' (۳۲) (بنام مولوی محمد سمیع، فروری ۱۸۸۴ء)

''ان دنوں اُردو کی ایک غزل لکھی تھی اور حمید کو بھیج دی۔ تم ان سے منگالو۔'' (۳۳) (بنام مولوی محمد سمیع، مارچ ۱۸۹۶ء)

''میں نے بھی ایک نظم لکھنی شروع کی ہے۔ جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

ع اے دکن! اے کہ بہارِ چمن از تست'' (۳۴)

(بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ۱۹۰۱ء)

''اب مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے، دیکھیے گا۔'' (۳۵) (بنام مہدی افادی، ۲۶ر اکتوبر ۱۹۰۶ء)

''میری ایک فارسی غزل دکن ریویو میں چھپی ہے۔ مخزن کی غزل تو ضرور نظر سے گزری ہوگی۔'' (۳۶) (بنام مہدی افادی، ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۶ء)

''بہت سی پُر جوش غزلیں لکھیں، آیئے تو سناؤں۔'' (۳۷) (بنام حبیب الرحمٰن خان شروانی، ۲۱ر جنوری ۱۹۰۸ء)

''ایک غزل کا ایک شعر مجھ کو مختلف وجوہ سے پسند آیا۔ آپ کو لکھتا ہوں۔ واقعیت اور اظہارِ قدرت پر نظر کیجیے۔'' (۳۸) (بنام حبیب الرحمٰن خان شروانی، ۱۸ر فروری ۱۹۰۸ء)

''بمبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں، جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ سولہ صفحے ہو گئے تو چھپنے کو دے دیئے--- اس میں کچھ پچھلے سال کا بھی حصہ ہے۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں،

جو شاید اک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں، لیکن حافظ تو کہتے ہیں:

ع ہر گہ کہ یاد روے تو کردم جواں شدم۔'' (۳۹)

(بنام مہدی افادی، ۲/ مارچ ۱۹۰۸ء)

''دستہ گل کی کم مائیگی پر افسوس آتا ہے۔ بمبئی پہنچوں تو کچھ پھول اور ہاتھ آئیں۔'' (۴۰) (بنام مہدی افادی، ۹/ اگست ۱۹۰۸ء)

''بمبئی سے اب کے بالکل خالی ہاتھ واپس آیا۔ ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہو سکا۔ اس شکایت میں ایک غزل لکھی۔ وہ بھی وہاں سے نکل کر۔ مطلع یہ ہے:

ہرچند غلط نیست کہ شبلی دل و دیں باخت
ایں حرف ولے مصلحت آمیز نبودہ است'' (۴۱)

(بنام مہدی افادی، ۴۷/ دسمبر ۱۹۰۹ء)

''چند اخلاقی اور تاریخی نظمیں لکھنی شروع کی ہیں۔ قرنِ اوّل کے اخلاقی واقعات نظم میں آ جائیں تو اچھا ہے۔'' (۴۲) (بنام مولانا عبدالباری ندوی، یکم مارچ ۱۹۱۳ء)

''ایک نظم الہلال میں اپنے نام سے بھیج دی ہے۔ زیادہ پرجوش ہے، لوگ اور برا مانیں گے۔'' (۴۳) (بنام مولانا عبدالباری ندوی، ۱۰/ جون ۱۹۱۳ء)

یہ چند اقتباسات تاریخی ترتیب سے نقل کیے گئے ہیں۔ اور ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک یا بہ الفاظِ دیگر شبلی کے عہدِ شباب سے سنہ وفات تک کے زمانے کو محیط ہیں۔ یہاں کی نقل میں طوالت اور کثرت کو اس لیے روا رکھا گیا ہے کہ ان کے ذریعے ان کی شاعرانہ شخصیت سے پردے اُٹھائے جا سکیں اور اندازہ ہو سکے کہ ان کی فکر ہر دَور میں کس طرح شعر و شاعری کے محور کرتی رہی ہے!

سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ابتدا میں انہیں مولویانہ مناظروں سے زیادہ دلچسپی رہی۔ قیامِ علی گڈھ کے دوران تاریخی و سوانحی رجحان غالب رہا۔ حیدرآباد پہنچ کر علمِ کلام کا غلبہ ہو گیا۔ ندوہ پہنچ کر شعر العجم تصنیف کی اور زندگی کے آخری دو سال سیرتِ نبوی کی تالیف

میں بسر کیے۔ لیکن مذکورہ بالا خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تمام مدت میں گوناگوں مصروفیات و رجحانات کے باوجود انھوں نے شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، کبھی نہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ حق بجانب ہوگا کہ شاعرانہ سرگرمیاں شبلی کی زندگی کا بنیادی و لازمی عنصر رہی ہیں، جسے نظر انداز کر کے ان کے ساتھ انصاف ممکن نہیں۔

شبلی کی شاعرانہ نفسیات کا ایک اور پہلو قابلِ ذکر ہے؟ چھپنے چھپانے کا شوق کسے نہیں ہوتا؟ لیکن شاعر میں یہ جذبہ اپنی انتہائی شکل میں پایا جاتا ہے۔ شبلی بھی اس سے مبرا نہیں۔ دیکھیے! کلام کی اشاعت کا اُنھیں کس قدر خیال ہے؟ لکھتے ہیں:

''افسوس! میرے قصیدے کی متعدد کاپیاں نہیں۔ ایک پرچہ جو میرے پاس تھا، وہ اس قدر سارے مدرسے میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کیا کہ مل دل کر پرزے پرزے ہوگیا۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کر لیں۔ مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا۔'' (۴۴)
(بنام مولوی محمد سمیع، اپریل ۱۸۸۱ء)

''میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لیے گیا اور اُمید ہے کہ جلد تیار ہو جائے۔ اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا، اشعار جمع کیے گئے--- یہاں مہدی کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسے کے لیے ایک نظم لکھی تھی، ''آمدہ'' اس کی ردیف ہے۔ اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیج دو تو وہ بھی چھپ جائے۔ تمہارے ذریعے اگر اس مجموعے میں اضافہ ہوسکتا ہو تو اُٹھا نہ رکھو۔'' (۴۵) (بنام مولوی محمد سمیع، مارچ ۱۸۹۲ء)

بہرحال اگر آپ سیاسی نظمیں بھی جلد چھاپنا چاہتے ہیں تو ضرور ہے کہ میرے تینوں آرٹیکل پولیٹیکل کروٹ والے بھی شامل کیجیے۔ اس نظم کی وہ نثر شرح ہے۔ کچھ دیباچہ بھی ہونا چاہیے، وہ بھی لکھ دوں گا۔'' (۴۶) (بنام محمد امین زبیری، ۵/جنوری ۱۹۱۳ء)

غزل کے متعلق اپنی رائے گزارش کرتا ہوں۔ ہندوستان میں آنکھوں محبت بولتے ہیں۔ ایران میں یاد نہیں آتا۔ اس لیے ''بچشم شوخ باد صہبائے الفت موج زن خواہد شدن'' کھٹکتا ہے۔

وہاں مہر و محبت کو نگاہ کے ساتھ باندھتے ہیں--- جانِ نازہ۔ وصل جانم--- الخ نازہ کی 'ہ' کو اتنا لمبا اور پورا نہیں ادا کرتے۔ بلکہ اس لہجے میں ادا کرتے ہیں۔ ع کہ بہ دام آمدہ ام نازہ گرفتار امشب۔ دل کی پامال خراب--- الخ اس شعر کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ویرانہ انجمن ہو جائے۔ خراب، ویرانہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے مقصد ادا ہوتا تھا، لیکن 'پامال' کے لفظ نے یہ پہلو کمزور کر دیا۔ صرف، خراب ہوتا تو خوب ہوتا۔ یا یوں کر دیجیے، ع دل کہ ویراں کردۂ صد ترک نازِ حسرت است--- بومہا از بسکہ گویم بے حساب و بے دریغ--- بے حساب اور بے دریغ دونوں یکجا ہو کر کالیستھوں کی زبان ہوگئی ہے۔ یوں کر دیجیے۔ ع
بسکہ خواہد گشت صرف بومہائے بے دریغ۔ یہ مصرع بھی چست نہیں اور کچھ کر لیجیے گا۔(۴۷)(۲۷/اگست ۱۹۰۱ء)

غزل دیکھی، ماشاء اللہ اب تو آپ بہت پختہ کہنے لگے۔ اب کے بھی نکتہ چینیاں کرتا ہوں، لیکن زبردستی ڈھونڈ کر نکالی ہیں۔

زرشک حسنِ نو تلخ است عیش شیریں را
زتابِ زلفِ سیاہ است روے لیلیٰ

ترصیع کا حسن چاہتا ہے کہ دوسرے مصرع میں بھی خطاب کا حرف ہو۔

زعکس روے تو آئینہ رو کش گل زار
بہ نطق شاد کن طوطیٔ شکر خارا

پہلے مصرعے میں فعل نہیں اور دوسرے میں ہے۔ اس سے دوسرے مصرع کا توازن اور تقابل کم ہو جاتا ہے۔ ترصیع میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔"(۴۸)(غالباً ۱۹۰۱ء)

"والا نامہ اور اشعار پہنچے۔ علماے ادب کہتے ہیں کہ حسان جاہلیت کے نامور شعرا میں تھے، لیکن اسلام آیا اور نعت کہنی شروع کی تو ان کا کلام رتبے سے گر گیا۔ فارسی میں دیکھیے نعت گو بہت کم پھلے ہیں۔ خسرو کے سوا اور خیر جامی بھی سہی، باقی جتنے ہیں، نہایت کم رتبہ ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ نعت گوئی نے ان کو ایسا بنا دیا ہے۔ سچ ہے ع رہ بردم تیغ است قدم را

مقصود اس درازنفسی سے یہ ہے کہ آپ بھی اس میدان میں نہ آیئے۔ ثواب مقصود ہے تو درود پڑھ لیا کیجئے۔ معاف فرمایئے نعت کی غزل صرف پھیکی نہیں بلکہ غلطیوں سے مملو ہے۔ سنیے ''برآستان پاک رساں زار نالیم'' زار نالیم، اُردو ہے فارسی نہیں، یا شاید میری نظر کا قصور ہے۔ نعت وغیرہ میں ہو تو لکھ بھیجئے گا۔ ع اے فخر اوّلیں و مباہات آخریں۔

موجب مباہات، یا اس قسم کا کوئی لفظ مباہات سے پہلے چاہیے، ورنہ معنی صحیح نہ ہوں گے۔

''جود بداماں حالیم'' خالی جود کو 'بدامن' کہنا صحیح نہیں۔ ''جب وولائے تو بہ سر خاکسار من۔

اس موقع پر سر کے ساتھ 'خاکسار' کی قید خلافِ مذاق ہے--- مدینہ کی غزل بھی بہت پھیکی ہے۔

اس کو یونہی چھوڑتا ہوں۔ مزید غزل نہایت چست اور فارسی انداز پر ہے۔

بردہان بذلہ سنج و بستہ لب
غنچہ کے دارد مجال برتری؟

بستہ لب کو غنچے سے کیا مناسبت! ع جانِ قربان ادائے دلبری ہیں۔ نون کا اعلان جائز بھی ہو تو یہاں بالکل خلافِ فصاحت ہے۔

ع ''از برتو حسن محجوب است کہ افتادہ'' ساقط الوزن ہے۔

ع یابی ہر قطرہ بہ کن ریختہ عمانی را
کردی قربان بہ ہر شعر صفاہانی را

''یابی' میں 'ی' گرتی ہے۔ کردی--- ایضاً'' (۴۹) (دسمبر ۱۹۰۱ء)

اب نکتہ چینی کی خدمت ادا کرتا ہوں۔ ع خوشم انداز قد سرو پا درگل نمی آید خوشم پیچھے آتا تو اچھا ہوتا، قد کا لفظ بھی کچھ ضروری نہیں۔ اس کے نکلنے سے تو الٹا اضافات کا بار بھی ذرا کم ہو جائے گا۔ ع بہ پہلویم رواں آں سرو خوش افتادہ بستی۔ پہلو میں چلنا ٹھیک نہیں۔ سامنے سے

گزرنا چاہیے۔ کیا خوب کہا ہے۔

گاہ گاہ از نظرم مست و غزل خواں بگذر
ورنہ برعہدۂ من نیست کہ رسوا باشم
ع بہ آغوش تے بودی و با بردار با پستی

واو کو اس طرح متحرک لانا فردوسی تک ختم ہو چکا۔ مقطع کا اخیر مصرع رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔'' (۵۰)

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ شبلی نے اگر اپنی شاعرانہ حیثیت پر زیادہ زور نہیں دیا یا شعرا کی صف میں حریفانہ کھڑے نہ ہوئے تو اس کا سبب حالات و مصالح زمانہ کی رعایت تھی یا ہم عصر علما کا تاثر و تعصب۔ ورنہ اگر حقیقت کی تہ میں اُتر کر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنے مزاج، کردار اور نفسیات کے اعتبار سے مکمل شاعر تھے۔ خطوط کے علاوہ بعض اشعار میں بھی اس کی جھلک آ گئی ہے۔ مثلاً:

میں بھی ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو — میں بھی ہوں ناز سلف تو ہے اگر فخر اُول
اے حریفو! تمہیں خالق کی قسم سچ کہنا — شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا؟

یہ نظم آئیں، یہ طرزِ بندش، سخن وری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی! مزا ہے طرزِ علی حزیں کا

سرگذشت عہد گل راہم ز شبلی می شنو — عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں فسانہ را
بہ آب و رنگ نظم خویشتن نازد چناں شبلی — کہ در اقلیم معنی کہنہ استاد است پنداری
شبلی از قامت بالائے قومی کرد سخن — یا مگر خود سخن از عالم بالامی کرد
ہماں کرد از سخن در ہند شبلی — کہ صائب در سوادِ اصفہاں کرد
در حیرتم کہ پا کئی گفتار راز کجاست — شبلی مگر زمردم ہندوستاں نبود

حواشی:

(۱) سید سلیمان ندوی: ''دیباچہ طبع اوّل'' کلیاتِ شبلی، اُردو، ص ا۔

(۲) سیّد سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۲۳۔
(۳) شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل، مرتبہ سیّد سلیمان ندوی، ص ۸۴۔
(۴) سیّد سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۲۵-۲۲۴۔
(۵) سیّد سلیمان ندوی: ''مولانا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں''، کلیاتِ شبلی اُردو، ص ۱۳۔
(۶) ظفر الملک علوی: مرتبہ ''گذارش'' مجموعۂ کلامِ شبلی، طبع اوّل، لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۹۱۸ء۔
(۷) سیّد سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۷۱۔
(۸) ایضاً۔
(۹) ایضاً۔
(۱۰) سیّد سلیمان ندوی: ''مولانا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں''، کلیاتِ شبلی اُردو، ص ۲۔
(۱۱) شبلی نعمانی: شعر العجم، جلد چہارم، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۔
(۱۲) ''معلوم نیست کہ قصیدہ بمولوی عبدالاحد شمشاد سپردی یا چوں نام من اور اہم از یاد بردی۔'' (بنام) مولوی محمد عمر، ۷/اکتوبر ۱۸۸۲ء، سیّد سلیمان ندوی، مرتبہ، مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم۔
(۱۳) سیّد سلیمان ندوی: ''مولانا شبلی اُردو کے شاعر کے لباس میں''، کلیاتِ شبلی اُردو، ص ۳۔
(۱۴) سیّد سلیمان ندوی: مرتبہ مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل، ص ۵۳۔
(۱۵) سیّد سلیمان ندوی: ''مولانا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں''، کلیاتِ شبلی اُردو، ص ۱۳۔
(۱۶) ڈاکٹر وحید قریشی: شبلی کی حیات معاشقہ، طبع اوّل، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۔
(۱۷) سیّد سلیمان ندوی: مرتبہ، مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل، ص ۳۵۰۔
(۱۸) ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۱۲۔
(۱۹) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۳۰۸۔
(۲۰) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۳۲۶۔
(۲۱) عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، لاہور، تاج کمپنی، سنہ ندارد، ص ۷۶۲ (تفسیر سورۂ شعراء، آیت ۲۲۴)۔
(۲۲) محمد امین زبیری، مرتبہ، خطوطِ شبلی، ص ۱۰۴۔
(۲۳) سیّد سلیمان ندوی، مرتبہ، مکاتیبِ شبلی، حصہ اوّل، ص ۶۹۔
(۲۴) ایضاً، ص ۷۰۔
(۲۵) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۸۴۔
(۲۶) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۷۹-۸۰۔
(۲۷) ایضاً، حصہ دوم، ص ۴۲۔
(۲۸) ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۱۱۔

(۲۹) ایضاً، حصہ دوم، ص ۵۱۔
(۳۰) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۵۸۔
(۳۱) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۶۰۔
(۳۲) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۶۶۔
(۳۳) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۹۶۔
(۳۴) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۳۱۔
(۳۵) ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۰۸۔
(۳۶) ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۰۹۔
(۳۷) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۶۱۔
(۳۸) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۷۰۔
(۳۹) ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۱۵۔
(۴۰) سیّد سلیمان ندوی، مرتبہ، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۲۱۷۔
(۴۱) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۲۲۴۔
(۴۲) ایضاً، حصہ دوم، ص ۱۵۸۔
(۴۳) ایضاً، حصہ دوم، ص ۱۶۰۔
(۴۴) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۵۴۔
(۴۵) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۳۴۷۔
(۴۶) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۲۴۸۔
(۴۷) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۲۸۔
(۴۸) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۳۰-۱۳۱۔
(۴۹) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۳۳-۱۳۴۔
(۵۰) ایضاً، حصہ اوّل، ص ۱۳۵۔